"نہیں۔ ہم نہیں بیچ رہے۔ اس شخص کو بالکل منہ نہیں لگانا ہے —"

۱۱

کتنے دنوں سے وہ مجھے یاد نہیں آئی تھی۔ بس جیسے دل و دماغ سے بسر گئی ہو۔ ہر جذبے کی ایک عمر ہوتی ہے، محبت کے جذبے کی بھی۔ اور ہر جذبہ کسی نہ کسی سہارے پرورش پاتا ہے۔ جذبے خلا میں تو پروان نہیں چڑھا کرتے۔ آپس میں کچھ ہوتا ہے بُرا یا بھلا تب ہی جذبے کو تقویت ملتی ہے۔ مگر یہاں تو بس دُور سے آتی ہوئی ایک شیریں آواز نے آن پکڑا تھا۔ پھر وہ آواز بھی غائب ہو گئی۔ آواز کا جادو کب تک چلتا۔ جب تک اس کے سحر میں رہا اسے ڈھونڈتا رہا، مضطرب پھرتا پھرا۔

"یار ممتاز، کیا کیا جائے۔ وہ تو چھو ہو گئی"۔

"تم تو کہہ رہے تھے کہ تم نے اس کا پتہ معلوم کر لیا ہے"۔

"ہاں۔ وہ تو معلوم کر لیا تھا۔ بینک میں کام کرتی ہے۔ میں نے بینک میں جا کر معلوم کیا۔ پتہ چلا کہ وہاں سے ٹرانسفر ہو گیا ہے۔ جس برانچ میں ٹرانسفر ہوا تھا اس کا پتہ لیا۔ وہاں پہنچا۔ پتہ چلا کہ لانگ لیو پر ہے۔ میں نے اس کے گھر کا پتہ معلوم کیا۔ مگر یہ دفتر کے لوگ بہت کمینے ہوتے ہیں۔ پتہ نہیں وہ کیا سمجھے۔ آئیں بائیں شائیں کر کے ٹال دیا۔ گھر کا پتہ نہیں بتایا"۔

"یار تھوڑا صبر کر لو۔ جانا کہاں ہے اسے۔ لیو ختم کرنے کے بعد تو آئے گی"۔

کتنا صبر کرتا۔ چند دن بعد پھر بینک کا پھیرا لگایا۔ پھر وقفہ وقفہ سے کتنے پھیرے

پھر یہ ہونے لگا کہ میں نے بینک میں قدم رکھا اور ایک نے دوسرے کو، دوسرے نے تیسرے کو اشارہ کیا اور سب کی نظریں مجھ پر، جیسے مجھے دیکھ کر محظوظ ہو رہے ہوں۔ کیا کرتا، سینہ پہ صبر کا پتھر رکھا اور ادھر کا پھیرا لگانا چھوڑ دیا۔ اور یوں بھی تو ہوتا ہے کہ آدمی ایک دفعہ صبر کر لے تو پھر صبر آتا چلا جاتا ہے اور شوق رفتہ رفتہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ہوا۔ کہاں ہر دم دل و دماغ میں بسی رہتی تھی کہاں اب کتنے کتنے دنوں تک اس کا خیال ہی نہیں آتا تھا۔ خیال آتا بھی تو کسی جذباتی ہیجان کے بغیر۔ کبھی کبھی بھولی بسری باتوں کے ساتھ اس کا بھی خیال آ جاتا۔ اور میں کتنی بے تعلقی سے اپنے اس جذباتی طوفان کو یاد کرتا اس احساس کے ساتھ کہ ایک آندھی تھی جو آئی اور گذر گئی۔

تو میں تو اپنی دانست میں اس کے سحر سے نکل آیا تھا۔ کتنے دنوں سے وہ مجھے بالکل یاد نہیں آئی تھی۔ بس اچانک اس کے خیال نے مجھ پہ شبخون مارا۔ میں اس شام گھومتا پھرتا آرٹ سنٹر میں جا نکلا جہاں تصویروں کی ایک نمائش کا افتتاح ہو رہا تھا۔ میں اس وقت آرٹ گیلری کی بالائی منزل میں تھا۔ تیسرے فلور پہ۔ تصویروں کے سامنے سے گذرتے گذرتے یوں ہی بے ارادہ میں نے نیچے کے فلور پر نظر ڈالی اور ایک دم سے ٹھٹھک گیا۔ ارے یہ تو ذکیہ ہے۔ میں تیزی سے پلٹا اور سیڑھیاں اترنے لگا کتنی تیزی سے میں سیڑھیاں اتر رہا تھا مگر سیڑھیاں تھیں کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھیں۔ زینہ ایکدم سے کھنچ کر کتنا لمبا ہو گیا تھا۔ مگر میری ٹانگوں میں بھی اس آن بجلی بھر گئی تھی سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ زقندیں بھر رہا تھا۔ ابھی سیڑھیوں پر تھا کہ اچانک ایک اور چہرہ سامنے آ گیا۔ میں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا:

"شیریں تم؟"

وہ بھی شاید مجھے دیکھ کر ٹھٹکی تھی۔ مگر فوراً ہی سنبھل گئی۔

"اس میں اتنے تعجب کی کونسی بات ہے؟"

"میرا مطلب ہے کہ کب آئیں۔ اپنے آنے کی اطلاع کیوں نہیں دی۔ آنے کے بعد تو اطلاع دی ہوتی"۔

"چلو اب اطلاع ہو گئی"۔

"کہاں ٹھہری ہوئی ہو؟"

اس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ دوسری ہی بات کی:

"تم تیزی میں کہیں جا رہے تھے۔ میں نے بیچ میں تمہیں روک لیا"۔

میں تو اسے دیکھ کر سب کچھ بھول گیا تھا۔ اس کے یاد دلانے پر یاد آیا:

"ہاں۔ ایک دوست تھے۔ کوئی بات نہیں۔ وہ انتظار کر لیں گے"۔

"نہیں۔ ان سے مل لو"۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ تم اوپر جا رہی ہو نا۔ تصویریں دیکھو۔ میں ان سے بات کر کے ابھی آیا۔ پھر باتیں ہوں گی"۔

میں عجلت سے نیچے آیا۔ گراؤنڈ فلور پر اس وقت بہت چہل پہل تھی۔ کتنی اچھی اچھی صورتیں امنڈی ہوئی تھیں۔ مگر وہ کہاں گئی۔ گھوم پھر کر دیکھا۔ ہر گوشے میں جا کر ٹٹولا۔ کہیں نہیں نظر آئی۔ میں حیران کہ اتنی سی دیر میں وہ کہاں چھو ہو گئی۔

لپک کر کاؤنٹر پہ گیا اور گیلری کے انچارج سے پوچھا:

"معاف کیجیے۔ یہاں ذکیہ احمد تھیں۔ کدھر چلی گئیں؟"

"ذکیہ احمد؟" انچارج نے ذہن پر زور ڈالا۔ "معاف کیجیے میں ان سے شناسا نہیں ویسے کچھ لوگ چائے کی طرف گئے ہیں۔ جن محترمہ کو آپ تلاش کر رہے ہیں شاید وہ وہاں ہوں"۔

تیزی سے اس گوشے میں گیا جہاں چائے کا اہتمام تھا۔ چائے پیتی خواتین میں سے

ایک ایک کی صورت دیکھی۔ جو میری طرف پشت کیے کھڑی تھیں بہانے بہانے سامنے جاکر ان کی شکلیں دیکھیں۔ کوئی کوئی پشت اتنی جاذب نظر تھی کہ گمان ہوا کہ شاید وہی ہے۔ کس عجلت میں سامنے جاکر اس کی صورت دیکھی کہ میں خود ہی اپنے اس انگھڑپن پر شرمندہ ہو گیا۔

جب یقین ہو گیا کہ وہ اس گوشہ میں نہیں ہے تو پھر میں لپک کر باہر آیا۔ اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے سبزہ زاروں میں اور خوش گوار روشوں پر جہاں آرٹ کی دلدادہ خواتین اہلی گہلی پھر رہی تھیں، نظر دوڑائی۔ وہ یہاں بھی نہیں تھی۔ لمبے لمبے ڈگ بھر کر گیٹ تک گیا کہ شاید واپس جا رہی ہو۔ گیٹ سے باہر بھی نظر ڈالی۔ وہ کہیں نہیں تھی۔

سب طرف سے مایوس ہو کر میں نے سوچا کہ اب کیا کیا جائے۔ ارے ہاں شیریں میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ واپس اندر گیا۔ گراؤنڈ فلور سے دوسرے فلور پر۔ دوسرے فلور سے تیسرے فلور پر۔ کہاں گئی وہ؟ سوچا کہ شاید میرا انتظار دیکھ کر نیچے چلی گئی ہو۔ واپس پھر گراؤنڈ فلور پر آیا۔ اور اب کے یہاں کا زیادہ تفصیل سے جائزہ لیا۔ نظر نہیں آئی۔ تو گویا وہ چلی گئی۔ میں اس کے اس رویے پر حیران ہوا، اور افسردہ بھی کہ ایک زمانے کے بعد ملی مگر کتنے رُوکھے پن کے ساتھ کہ ذرا میرا انتظار بھی نہیں کیا۔ شیریں تو بالکل ہی بدل گئی میں نے سوچا اور میرا دل بیٹھ گیا۔ اسے دیکھ کر میں کتنا خوش ہوا اور اب کتنا ملول ہوا تھا۔

"بوجان۔ ایک خبر سناؤں۔ شیریں آئی ہے۔"

"شیریں؟" بوجان نے تعجب سے مجھے دیکھا۔

"ہاں شیریں۔ میں آرٹ سنٹر تصویروں کی نمائش پر گیا تھا وہاں اچانک اس سے مڈبھیڑ ہو گئی۔"

"اچھا! پھر کہاں ہے وہ؟"

"بوجان۔ اس نے کمال کیا۔ باتیں کرتے کرتے میں ذرا تصویریں دیکھنے لگا۔ وہ

نظروں سے ایسی اوجھل ہوئی کہ پھر نظر ہی نہیں آئی"۔

"اے لو۔ وہ چھلاوہ تھی کہ غائب ہوگئی"۔

"بوجان میں صحیح کہہ رہا ہوں۔ میں خاصی دیر وہاں رہا کہ شاید یہیں کہیں ہو۔ سب لوگ چلے گئے ہیں تب میں وہاں سے نکلا ہوں۔ اس نے کمال ہی کر دیا"۔

"آخر کس باپ کی بیٹی ہے۔ خدا بخشے تمہارے چچا بھی ایسے ہی بے مروت تھے۔ علی گڑھ میں جا کر ایسے بسے کہ پھر مرنے جینے کے موقعوں پر ہی ان کی صورت نظر آتی تھی اور اب تو قصہ ہی دوسرا ہے۔ تو کہاں میں کہاں؟" چپ ہوئیں پھر افسردگی سے بولیں۔ "اس نگوڑی ہجرت نے تو خون کے رشتے تک ختم کر دیے"۔

پھر چپ ہوگئیں۔ کتنی دیر تک چپ رہیں پھر بولیں:

"بیٹے، اس کا پتہ کرو۔ اس لڑکی کی آنکھ میں تو سور کا بال ہے مگر ہمارا خون تو ابھی سفید نہیں ہوا ہے"۔

بوجان کی ان باتوں پر میں نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔ ظاہر ہیں تو ایسے بنا رہا جیسے میں نے شیریں کی اس حرکت کو سرسری لیا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اندر سے میں بہت مضطرب تھا۔ یوں جلدی ہی سونے کے لیے جا لیٹا لیکن رات گئے تک کروٹیں بدلتا رہا۔ رہ رہ کے خیال آتا کہ شیریں نے یہ کیا کیا؟ صورت دکھا کے کیسی غائب ہوئی؟ واقعی وہ تو چھلاوہ بن گئی۔ کیوں ایسا کیا؟ کیوں پر آکر میں سوچ میں پڑ گیا۔ سو سو طرف دھیان گیا۔ بس اسی میں وہ گھڑی یاد آگئی جب اسے چھوڑ کر میں نیچے اترا تھا اور کس عجلت کے ساتھ گراؤنڈ فلور پر پہنچا تھا اور اسے نہ پا کر کاؤنٹر پہ جا کر انچارج سے ذکیہ کے متعلق استفسار کیا تھا۔ اور اچانک میرے دماغ میں یہ بات آئی کہ شاید اس نے میری بات سن لی تھی۔ شاید وہ میرے اترنے کے بعد وہیں سیڑھیوں پر کھڑی دیکھتی رہی تھی کہ میں کیا کر رہا ہوں، کسے ڈھونڈ رہا ہوں؟ اس خیال نے تو میری سٹی گم کر دی۔ واقعی؟ کیا واقعی وہ بھانپ گئی تھی؟

کیا اس نے سن لیا تھا؟ پھر تو غضب ہو گیا۔ شیریں بھلا معاف کرے گی۔ جب اس نے اس وقت معاف نہ کیا تو اب کیسے معاف کر دے گی؟ اس وقت تو صرف شک تھا اور اب تو..... بس اس کے ساتھ ہی مجھے وہ واقعہ یاد آ گیا اور وہ وقت جب میں واقعی میں تھا۔ اب کی طرح تھوڑا ہی کہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ میں ہوں۔ آدمی بھی کس طرح وقت کے ساتھ اپنے آپ کو گنواتا کھوتا چلا جاتا ہے۔ اور حالات و واقعات کو جانے دیجیے خود اس کی عمر اسے کتنا خراب کرتی چلی جاتی ہے کہ وہ پھر وہ رہتا ہی نہیں۔ میں اس وقت جو تھا وہ میرے تصور میں گھوم گیا۔ اس زمانے کا اخلاق حسن متقلم علی گڑھ یونیورسٹی، کہ اب اس کے لیے وہ واحد غائب کے صیغے میں تھا۔ اپنے گھنے کالے بالوں اور کلین شیو کے ساتھ سیاہ شیروانی میں ملبوس۔ وہ ان دنوں اس دنیا میں تھا جو اپنی سیاہ چست شیروانیوں اور سیاہ برقعوں کے ساتھ الگ پہچانی جاتی تھی۔ ہر سیاہ برقعہ اس کے لیے ایک بھید تھا۔ ہر سیاہ برقعہ کو دیکھ کر تجسس میں پڑ جاتا کہ اس کے بیچ کونسا وجود ہے اور نقاب کے پیچھے کیسا چہرہ ہے۔ نقاب پڑی رہتی پھر بھی کسی نہ کسی طور ایک جھلک دکھائی دے ہی جاتی، کبھی گورے گال کا شکارا، کبھی روشن آنکھوں کا ایک آن کا درشن۔ بہرحال ایک چہرہ تو بے نقاب تھا کہ آنکھوں میں سماتا دل میں اترتا چلا جا رہا تھا۔ اب وہ چراغ حویلی کی فضا سے نکل کر ایک نئی فضا میں مل رہے تھے۔ ایک نئے جذبے کے ساتھ۔ اس نئے جذبے کے اثر میں آ کر انہیں یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ پہلی مرتبہ ایک دوسرے کو دیکھ اور جان رہے ہیں۔ شروع شروع میں وہ اپنی انگریزی سنوارنے کے لیے پورا پورا ناول اکٹھے پڑھ ڈالتے تھے۔ ناول کے ہیرو ہیروئن ان سے کچھ نہیں کہتے تھے۔ پھر یہ ہوا کہ کبھی کیٹس کی کبھی شیلے کی نظم پڑھتے پڑھتے دفعتاً جھجک جاتے۔ پھر نظم اپنی جگہ پہ رہ جاتی اور وہ کسی اور ہی فضا میں پہنچ جاتے۔ ان کے درمیان ایک نئی جھجک اور ایک نئی بے تکلفی جنم لے رہی تھی۔ ایک نیا انجانا پن، ایک نئی جانکاری۔

دھیرے دھیرے کر کے وہ ایک دوسرے کے کتنے قریب آ گئے تھے مگر کتنی تیزی سے وہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ دلوں کے قریب آنے میں کتنا وقت لگتا ہے پر جدائی کتنی جلدی ہو جاتی ہے۔ بس ایک شک کی لہر آئی اور دلوں میں فرق پیدا کرتی چلی گئی۔

"شیریں آجکل تمہاری رابعہ نہیں آ رہی؟"

شیریں ایکدم چوکنی ہو گئی۔ اسے غور سے دیکھا: "میری رابعہ..... کیوں تمہیں اس کا انتظار تھا؟"

وہ سٹپٹا گیا۔ "نہیں۔ میں نے تو یونہی پوچھ لیا تھا۔ تمہارے پاس روزانہ جو آیا کرتی تھی۔"

"تو تم اس ٹوہ میں رہا کرتے تھے کہ وہ کب یہاں آتی ہے اور کب جاتی ہے!"

اس نے بڑی مشکل سے اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے ایک راستہ نکالا: "میں تو صرف اس لیے پوچھ رہا تھا کہ اس نے مجھ سے شیکسپیئر کے نوٹس مانگے تھے۔ میں نے سوچا کہ تمہاری سہیلی ہے چلو اس کی ہیلپ کیے دیتے ہیں۔"

"ہوں۔ یہ کب کی بات ہے۔ میرے سامنے تو یہ بات ہوئی نہیں تھی، میرے پیچھے ہوئی ہو گی۔ اور کیا باتیں ہوئی تھیں؟" شیریں کا شک اور تقویت پکڑ گیا اور وہ مزید الجھ گیا۔

وہ ایک بات کہہ کر پکڑا گیا۔ شیریں نے تو باقاعدہ جرح شروع کر دی۔ اس جرح میں اس کا وہی حال ہوا جو عدالتی جرح میں ایک ناتجربہ کار ملزم کا ہوتا ہے۔ شیریں کا شک بڑھتا چلا گیا، اس کے ساتھ ساتھ پارہ بھی چڑھتا چلا گیا۔ پہلے وہ غصے سے آگ بگولا ہوئی، پھر سسکیاں لے کر رونے لگی۔ بس اسی جوشِ گریہ میں اس نے ماں کے سامنے یہ مقدمہ پیش کر دیا:

"امی، یہ اخلاق میری سہیلیوں سے اکیلے میں کیوں باتیں کرتا ہے؟"

اور آن کی آن میں اس گھر میں اُس کا چال چلن مشکوک ٹھہر گیا۔ بس اس کے ساتھ ہی دونوں کی منگنی کی جو بات چل رہی تھی، وہ بیچ ہی میں ختم ہو گئی۔

"اخلاق، تم ابھی جاگ رہے ہو؟"

"ہوں۔" ایک دم سے واحد غائب کے صیغہ سے واحد متکلم کے صیغہ میں۔ "ہاں نیند نہیں آ رہی۔"

"تم تو لیٹتے ہی خراٹے لینے لگتے تھے۔ آج تمہیں کیا ہو گیا۔ اتنی دیر سے دیکھ رہی ہوں کروٹیں بدلے جا رہے ہو۔"

میں زبیدہ کو کیا بتاتا۔ میں نے الٹا اس سے سوال کر دیا: "مگر تم بھی ابھی تک نہیں سوئی ہو۔"

"مجھے تو اس مکان کی فکر کھائے جا رہی ہے۔" اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں، اس نے سوال داغ دیا: "پھر تم نے کیا سوچا ہے؟"

"کس بارے میں؟" سوال اتنا اچانک تھا کہ واقعی میری سمجھ میں نہیں آیا کہ زبیدہ نے کس بارے میں یہ پوچھا ہے۔

زبیدہ جھنجھلا گئی:

"کونسی بیٹی بیاہنے کو بیٹھی ہے جس کے بارے میں پوچھوں گی۔ آشیانے کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔"

"آشیانے کے بارے میں۔۔۔۔؟" میرے لیے زبیدہ کے سوالوں کو سمجھنا اور جواب دینا اس وقت دوبھر ہوا جا رہا تھا۔ میں تو کسی اور ہی فضا میں پرواز کر رہا تھا، جہاں دنیا کے یہ قصے تھے ہی نہیں۔ بس شیریں تھی اور میں تھا۔ میں جو اُس وقت تھا۔ مگر اسی کے ساتھ مجھے تعجب ہوا کہ شیریں کا تو ابھی تک کچھ بھی نہیں بگڑا۔ ہاں اس وقت گگڑی کچی تھی، اب پک کر بھر گئی ہے اور ترش گئی ہے۔ واقعی کیا ترشی ترشائی نظر آ رہی تھی کہ

ہر خم ہر گولائی نمایاں اور متناسب۔ اور بھری ہوئی ایسی کہ اب چھلکی۔ اور اب مجھے افسوس ہونے لگا کہ اسے نظر بھر کر دیکھا بھی نہیں۔ کیسی غائب ہوئی، بس جیسے آنکھوں کے آگے بجلی کوند گئی ہو۔ اور پھر مجھے وہی خیال ستانے لگا کہ شاید اسے شک پڑ گیا تھا۔ مگر کمال ہے۔ اتنے برسوں بعد ملی اور اسی شکی طبیعت کے ساتھ۔ شک بھی، میں نے سوچا، کیا فتنہ ہے۔ دو دل کتنی مشکلوں سے، کتنے نازک مرحلے طے کر کے قریب آتے ہیں، گھل مل جاتے ہیں جیسے کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ مگر ایک ذرا سا شک آن کی آن میں ساری قربتوں، ساری ملاقاتوں کو اکارت کر دیتا ہے۔

"وہ پراپرٹی ڈیلر تو پھر نہیں ملا؟"

"پراپرٹی ڈیلر؟" میں چکرا گیا۔ چکرانا ہی تھا۔ میرا دھیان تو کہیں اور بھٹک رہا تھا۔

"میں نے کوئی پہیلی تو نہیں پوچھی ہے۔" زبیدہ پھر جھنجھلا گئی۔ "سیدھی سی بات پوچھی ہے کہ پراپرٹی ڈیلر جو اس دن آیا تھا پھر ملا یا نہیں؟"

"نہیں"۔

"ایک دفعہ صورت دکھا کے کمبخت کہاں روپوش ہو گیا؟"

اسی گھڑی جیل کے پہریدار کی آواز آئی: "جاگتے رہو"۔ اور تب مجھے احساس ہوا کہ رات واقعی بہت گذر گئی ہے۔

"زبیدہ اب سو جاؤ۔ رات بہت ہو گئی ہے۔ اس مسئلہ پر پھر بات کریں گے"۔

"میں تو اچھی بھلی سو گئی تھی۔ تمہاری الٹی سیدھی کروٹوں نے میری نیند اچاٹ کر دی"۔

بہر حال میری بات نے اثر کیا۔ اس نے مسئلہ کو ملتوی کیا اور تھوڑی ہی دیر میں خراٹے لینے لگی۔ ادھر میں شیریں کے تصور کے ساتھ آدھا سو رہا تھا آدھا جاگ رہا تھا۔

۱۲

اے دلمن، ہوش کی دوا کرو۔ خدا کا خوف کرو۔ مجھ بوڑھی پہ تہمتیں لگاتی تم اچھی نہیں لگتیں۔ بھلا میں کیوں پوت میاں کو سکھاتی پڑھاتی۔ میں ان ماؤں میں سے نہیں ہوں جو بیٹے بہو کی کنسوئیاں لیتی پھرتی ہیں اور بیٹے کو اکیلا پا کے اس کے کان بھرتی ہیں۔ میں تو جو بات کرتی ہوں عالم آشکارا کرتی ہوں اور جو بات مجھ کال کھاتی نے کہی تھی تمہارے بھلے ہی کے لیے کہی تھی۔ اری بی بی مجھے اب اس گھر کو کونسا برتنا ہے۔ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں۔ سانس کی ڈوری اب ٹوٹی کہ اب ٹوٹی۔ اس گھر میں تو تمہیں ہی رہنا بسنا ہے۔ دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو۔ ابھی تو تم دو جنے ہو۔ جب اللہ رکھو پوت ہوں گے اور دلہنوں کی ڈولیاں آئیں گی پھر تمہیں اس گھر کی قدر معلوم ہوگی۔ پھر میری بات کی بھی قدر معلوم ہوگی۔ ویسے تو تم سیاہ کرو سفید کرو، میں کون دخل دینے والی۔ لیکن جب گھر اجڑنے کے سامان ہوں تو منہ میں تالا ڈال کے کیسے بیٹھ جاؤں۔ اور دنیا تم دونوں کو تو یہ کہہ کے بخش دے گی کہ ناتجربہ کار تھے، عقل پہ پردہ پڑ گیا تھا۔ مگر میرے منہ میں گو دے گی کہ بڑھیل سفید چونڈا لیے بیٹھی رہی اور بیٹے کے گھر کی نیلامی کو ٹکر ٹکر دیکھتی رہی تو مجھے سمجھانا تھا سمجھا دیا۔ باقی تمہیں اختیار ہے۔ تمہاری چیز ہے۔ تم ہی نے بنایا تم ہی اسے اُجاڑ دو"۔ بولتے بولتے بوجان مجھ سے مخاطب ہوئیں: "میرے لال، تمہارا گھر ہے۔ میں کون ہوتی ہوں بولنے والی۔ بیچو، نیلام کرو۔ کسی کو بخش دو مگر تھوڑا انتظار کر لو۔ میں بس

آخری دموں پہ ہوں۔ یہ حسرت پوری ہو جانے دو کہ جنازہ اپنی ڈیوڑھی سے نکلے"۔

بوجان نے تو اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔ زبیدہ چپ۔ میں بھی بالکل چپ رہا۔ سچ پوچھو تو زبیدہ کی باتوں سے میں اپنے اس ارادے میں کہ مکان کو بیچنا نہیں ہے، کچھ ڈانوا ڈول ہو گیا تھا اور بوجان نے جیسے میرے تذبذب کو بھانپ لیا ہو۔ مگر میں تو یہ سوچ کر پریشان تھا کہ گھر میں یہ کیا فساد شروع ہو گیا۔ وہ جو گھروں میں ساس بہو کے بیچ کٹا چھنی رہا کرتی ہے اس سے اپنا گھر آج تک نا آشنا تھا۔ ستم ظریفی دیکھو کہ جب تک ہم لوگ کرائے کے مکانوں میں رہے امن چین سے رہے۔ ساس بہو پر واری، بہو ساس کی خدمت گذار۔ مگر اپنے گھر میں آ کر بسے تو جھگڑے ٹنٹے شروع ہو گئے۔ سو طرح کے وسوسے، اندیشے، بدشگنیاں، الزام، جوابی الزام، زبیدہ کو میری طرف سے خوش فہمی پیدا ہو چلی تھی کہ میں اس کے اثر میں آ گیا ہوں اور مکان بیچنے پر آمادہ ہوں مگر یہ کہ بوجان موقعہ پا کر میرے کان بھرتی ہیں اور میں پھر بدک جاتا ہوں۔ ادھر بوجان بھی میری طرف سے اتنی ہی خوش فہمی رکھتی تھیں کہ مکان بیچنے کا شگوفہ ان کی بہو نے چھوڑا ہے۔ خیر یہاں تک تو وہ صحیح سمجھتی تھیں مگر اسی کے ساتھ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ میں بیوی سے بہت دبتا ہوں اور دباؤ میں آ کر مکان بیچ ڈالنے پر طوعاً و کرہاً آمادہ ہو گیا ہوں۔ میں خوش فہمی کے ان دو پاٹوں کے بیچ میں پستا چلا جا رہا تھا۔

بوجان اور زبیدہ دونوں پر میں کتنا حیران تھا۔ بوجان پر یہ سوچ کر کہ انھوں نے تو اپنی آنکھوں سے شاد و آباد گھروں کو اجڑتے اور اونچی حویلیوں کو ڈھیتے دیکھا تھا، پھر بھی ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ گھر کتنے بے ثبات ہوتے ہیں۔ اصل میں زبیدہ سے زیادہ بوجان نے مجھے مکان بنانے پر آمادہ کیا تھا۔ میرے اندر یہ بات اتار دی تھی تھوڑے وقت ہی کے لیے سہی کہ جب تک آدمی کا اپنا مکان نہیں ہوتا وہ اکھڑا ہوا رہتا ہے۔ میری سادہ دل ماں نے مطلق یاد نہ کیا کہ کتنے جمے جمائے گھرانے اور بڑھ کے پیڑ کی مثال

مستحکم لوگ اس کی آنکھوں دیکھتے گہری بنیادوں اور اونچی چھتوں والے محل دو محلوں سے نکلے اور پت جھڑ کے پتوں کی طرح دور کی گلیوں میں رُلتے پھرے۔ مگر مجھے رفتہ رفتہ یہ احساس ہوا کہ آدمی مکان تعمیر کرے تو ساتھ میں ایک کشتی بھی ضرور تیار کرے کہ کیا خبر ہے کہ کب گھر کے چولھے کی تہ پھٹے اور اس میں سے پانی اُبلنے لگے۔

زبیدہ پر یہ سوچ کر حیران ہوا کہ اس نیک بخت نے اس وقت مکان بنانے کیلیے میری نلی اکھاڑ دی تھی اور اب اسی مکان کو ٹھکانے لگانے کے لیے میری نلی اکھاڑے دے رہی تھی۔ ایک بیوی کا مکان بنانے کے لیے اصرار تو میری سمجھ میں آتا ہے کہ اس کے یہاں احساسِ تحفظ کے لیے خالی شوہر کا ہونا کافی نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ مکان کا ہونا بھی ضروری ہے اور بینک بیلنس کا ہونا بھی۔ شوہر، مکان، بینک بیلنس ـــــ یہ تین چیزیں مل کر بیوی کو احساسِ تحفظ عطا کرتی ہیں۔ مگر ایک بیوی شوہر سے مکان بیچ ڈالنے کا تقاضا کرے، تعجب کی بات تو یہ تھی۔ یہ تو خیر تھا ہی کہ جیں کی ہمسائگی نے اسے ایک وہم میں مبتلا کر دیا تھا مگر پھر مجھے ایکدن یوں ہی خیال آیا کہ ہمارے اڑوس پڑوس سے کتنے ہی کوٹھی والے ہمارے دیکھتے دیکھتے اپنی کوٹھیاں بیچ کھوچ کر گلبرگ کے علاقہ میں جا بسے ہیں کیا وہ بھی ایسے ہی کسی وہم میں پڑ گئے تھے۔ نہیں ان کا مسئلہ دوسرا تھا۔ بات یہ تھی کہ یہ علاقہ اس مقامِ بلند سے جسے نئی زبان میں پوش لوکلٹی کہتے ہیں، بہت تیزی سے گر رہا تھا۔ اب سے پہلے یہاں آکر رہنا بسنا سٹیٹس کی نشانی سمجھا جاتا تھا، اب یہاں سے نقل مکانی کر کے گلبرگ یا کسی ایسی نئی آبادی میں جا کر بسنا سٹیٹس کی نشانی بن گیا تھا۔ ایک تو یہ کہ شہر کی توسیع کے ساتھ نئے نئے پوش علاقے وجود میں آ رہے تھے اور پرانے پوش علاقے زوال کرتے جا رہے تھے جیسے انہیں گھُن لگ گیا ہو۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ اس علاقے میں دیکھتے دیکھتے دکانیں بہت کھل گئی تھیں۔ موٹر ورکشاپس، جنرل سٹورز، ہوٹل، کباب تکے کی دکانیں، پان سگریٹ اور کولڈ ڈرنکس کے سٹال غرض ہر رنگ کی دکان اب یہاں نظر

آتی تھی اور ہر قماش کی مخلوق۔ مکینک، پرچون فروش، تھوک فروش، تیلی تبولی، پراپرٹی ڈیلر، غرض یہ کہ رنگ رنگ کی چھوٹی مخلوق یہاں امنڈ آئی تھی۔ گویا اب یہ سڑک ٹھنڈی سڑک نہیں رہی تھی۔ جن راستوں پہ کسی زمانے میں صبح منہ اندھیرے اور شام پڑے شرفا چہل قدمی کرتے نظر آتے تھے وہ رستے اب ہر طرح کے ٹریفک اور ہر قماش کی مخلوق کے شور سے اور دھوئیں اور گرد کے اڑنے سے گرم گرد آلود ہو گئے تھے۔

ایک واقعہ اور ہوا۔ اچانک اس علاقہ میں زمین کی قیمتیں چڑھ گئیں۔ عام خیال یہ تھا کہ یہ علاقہ کمرشیل ایریا بننے والا ہے۔ یہ کمرشیل ایریا بھی عجب متعدی شے ہے نئے شہروں میں بالکل آکاس بیل کی طرح پھیلتا ہے اور سرسبز علاقوں کو نگلتا چلا جاتا ہے۔ جیسے صحرائی علاقوں میں ریگستان پھیلتا ہے اور مرغزاروں نخلستانوں کو نگلتا چلا جاتا ہے تو کمرشیل ایریا اس شہر کی کتنی شاداب آبادیوں کو اپنی لپیٹ میں لینے کے بعد تیزی سے ہمارے علاقے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ادھر مجھے یہ سوچ سوچ کر وحشت ہو رہی تھی کہ اگر یہ علاقہ واقعی کمرشیل ایریا بن گیا تو انسانی مخلوق کی ریل پیل اور ٹریفک کا شور تو اس سرسبز علاقے کی چڑیوں کا جینا اجیرن کر دے گا۔ پھر وہ کاہے کو یہاں ٹھہریں گی۔ آدمی تو مکان تعمیر کر کے اپنے پاؤں میں بیڑیاں ڈال لیتا ہے۔ چڑیوں کے پاؤں میں ایسی کوئی بیڑی نہیں ہوتی۔ کسی علاقے کی آب و ہوا ان کے لیے سازگار نہ رہے تو انہیں کونسی طاقت وہاں باندھ کر رکھ سکتی ہے۔ تو اگر اس علاقے کی ہوا بدلی تو چڑیاں تو پھر سے اڑ جائیں گی۔ اور ہر صبح کو جو میرے ہار سنگھار تلے سبھا جمتی ہے وہ بکھر جائے گی۔ پھر میں کیا کروں گا؟ ارد گرد آدمی ہی آدمی ہوں اور چڑیا کوئی نہ ہو! ایسی غیر انسانی صورتحال کا تصور میرے لیے سخت گھناؤنا تھا۔ وہ تو یہ کہیے کہ اس دھرتی پہ چرند پرند اور پھول اور درخت بھی ہیں۔ اگر صرف انسانی مخلوق ہوتی تو اس کے بیچ بسر کرنا کتنا اذیت ناک عمل ہوتا۔ تو جب میں نے آنے والی زندگی کا اس طرح تصور کیا کہ چڑیاں ہجرت

کر چکی ہیں اور ہار سنگھار کا پیڑ مرجھا چکا ہے اور چاروں طرف آدمی ہی آدمی ہیں تو مجھے زندگی کا یہ نقشہ بہت مکروہ نظر آیا۔

زبیدہ نے جب میرے اس وسوسے کو سمجھ لیا تو پھر اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ جان لیا کہ اب اس کی بات بے اثر نہیں جائے گی۔ رفتہ رفتہ یہ صورت حال ابھری کہ اس علاقے سے نقل مکانی زبیدہ اور مجھے دونوں کو دوا کھانے لگی۔ زبیدہ کو یہ نظر آرہا تھا کہ کمرشیل ایریا بننے کی صورت میں آشیانہ اچھے داموں نکل جائے گا جس سے گلبرگ میں اچھی بھلی کوٹھی تعمیر ہو سکے گی۔ اگر اس رقم سے پورا نہ پڑا تو اس نے یہ تو جان ہی لیا تھا کہ میں ٹپس لگا کر کہیں نہ کہیں سے قرضے کا بندوبست کر سکتا ہوں۔ بہر حال گلبرگ میں کوٹھی بن جائے گی۔ یوں سٹیٹس بھی بلند ہو جائے گا اور جیل کی ہمسائیگی سے بھی نجات مل جائے گی۔ ادھر میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس سے پہلے کہ چڑیاں میری پھولوں کی کیاری سے ہجرت کر جائیں اور اس سے پہلے کہ میرے پھول پودے ٹریفک کے شور اور دھوئیں سے جھلس جائیں مجھے اس علاقے سے نکل جانا چاہیے۔ اس خیال نے دھیرے دھیرے اتنی شدت پکڑی کہ میں بالکل اس کی گرفت میں آگیا۔ اس عالم میں مجھے اس پراپرٹی ڈیلر کا خیال آیا۔ تب میں دل ہی دل میں زبیدہ کی عاقبت اندیشی کا قائل ہوا جو پراپرٹی ڈیلر کو قطعی جواب دینے کے حق میں نہیں تھی۔ ایک تاسف کے ساتھ میں نے سوچا کہ خواہ مخواہ میں نے اسے دھتکارا۔ ڈور پہ لگائے رکھتا تو آج اس سے کام لیا جا سکتا تھا۔ اور کمال ہوا کہ جس دن میرے دماغ میں یہ بات آئی اس کے دوسرے دن ہی وہ آن موجود ہوا میں تو ہکا بکا رہ گیا۔ کیا اسے القا ہوا تھا۔ میں ڈر گیا کہ یہ شخص کیا شے ہے۔ آدمی ہے یا جن ہے۔

اس دفعہ پراپرٹی ڈیلر سے میں بہت گرمجوشی سے ملا۔ زبیدہ کو اندر پتہ چلا کہ پراپرٹی ڈیلر آیا ہے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس کی تو دلی مراد بر آئی تھی۔ فوراً ہی چائے بنانے بیٹھ گئی۔ مجھے بلا کر سمجھایا کہ اسے پہلے کی طرح مت ٹرخا دینا۔ ذرا کریدو تو سہی کہ

زمینوں کا کیا بھاؤ جا رہا ہے اور اگر ہم اپنا آشیانہ بیچیں تو کتنے میں نکل جائے گا؟ مگر فوراً ہی اسے احساس ہوا کہ اس نے غیر محتاط انداز میں بات کر دی ہے۔ سو اس نے ٹکڑا لگایا کہ بے شک ہم نہ بیچیں اور کونسا ابھی بیچ رہے ہیں مگر ہر بات کا پتہ تو ہونا چاہیے۔

میں زبیدہ سے سبق پڑھ کر باہر آیا اور پراپرٹی ڈیلر کے پاس بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ خیال تھا کہ وہ خود ہی مکانوں جائدادوں کی خرید و فروخت کا ذکر چھیڑے گا مگر اس نے اشارتاً بھی کوئی ایسا ذکر نہیں کیا۔ اور اور باتیں کرتا رہا۔ کچھ موسم کا ذکر، کچھ میرے مشاغل کے بارے میں پوچھ گچھ۔

آخر خود میں نے ہی ذکر چھیڑا: "کہیے آجکل آپ کا کاروبار کیسا جا رہا ہے؟"

"پچھلے دنوں تو مندا ہی رہا۔ ہاں اس وقت بہت اعلیٰ جا رہا ہے"۔

"اچھا؟"

"صاحب آپ کو تو پتہ ہونا چاہیے۔ آپ کے علاقے میں تو ان دنوں بہت خرید و فروخت ہو رہی ہے۔ ایک دو کوٹھی والوں سے تو میں نے معذرت کر لی۔ انہیں بیچنے کی کچھ زیادہ ہی جلدی تھی۔ لوگ بھی تو ہتھیلی پر سرسوں جماتے ہیں۔ میں نے معذرت کر لی کہ جناب ابھی تو میری مٹھی میں کوئی گاہک نہیں ہے"۔

"اچھا، مجھے تو پتہ نہیں مگر خرید و فروخت میں یہ گرما گرمی کیسے پیدا ہو گئی؟"

"صاحب بات یہ ہے کہ یہ علاقہ کمرشیل ایریا میں آ گیا ہے۔ بس سمجھو کہ فیصلہ ہو گیا ہے۔ اس سے اچانک زمین کا بھاؤ چڑھ گیا ہے۔ کوٹھیوں والوں کے تو وارے نیارے ہو گئے۔ منہ مانگی قیمت مل رہی ہے۔ تو اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ رہائش کے لیے تو یہ علاقہ اب موزوں رہا نہیں۔ تو ایک تو شرفا ویسے ہی یہاں سے جانے پہ تیار ہیں۔ پھر انہیں دام بھی اچھے مل رہے ہیں"۔

"واقعی یہ جگہ کمرشیل ایریا میں آ گئی ہے؟"

"بالکل صاحب۔ فیصلہ ہو چکا ہے۔ فائل اس وقت گورنر صاحب کی میز پر ہے۔ ایک دو دن میں ان کے دستخط ہو جائیں گے۔ پھر دیکھیے یہاں کیسا انقلاب آتا ہے"۔

"ہاں۔ مگر اس علاقے کا سکون ختم ہو جائے گا"۔

"یہ تو ہے۔ یہاں کا سکون تو واقعی غارت ہو جائے گا۔ اتنا شور ہو جائے گا کہ آپ جیسے نفیس مزاج لوگوں کے لیے تو یہاں سانس لینا مشکل ہو جائے گا"۔

"پھر تو کسی نہ کسی وقت یہ علاقہ چھوڑنا ہی پڑے گا۔ مگر بڑی مشکل ہے۔ اچھی کالونی میں تو زمین نایاب ہے"۔

"پیسہ پاس ہو تو پھر نایاب نہیں ہے۔ گلبرگ میں ابھی بہت گنجائش ہے۔ لوگ گلبرگ کی طرف بہت دوڑ رہے ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ کینال بینک اس سے بہتر علاقہ ہے۔ جنیٹری کا رجحان تو اسی طرف ہے۔ پھر وہاں زمین کا ریٹ بھی کم ہے"۔

"اچھا؟"

"بالکل۔ ابھی آپ کی کوٹھی کے دو جنٹلمینوں کو تو میں دلوا چکا ہوں۔ بہت سوہنی جگہ ملی ہے۔ اور سستی بھی ہے۔ ویسے صاحب زمین کی قیمت وہاں بھی بہت تیزی سے چڑھ رہی ہے۔ ایک مہینے کے اندر اندر ریٹ بائیس ہزار مرلہ سے پچیس ہزار مرلہ تک پہنچ گیا"۔

میں نے اس کا بیان بہت توجہ سے سنا۔ سوچ رہا تھا کہ مطلب کی طرف کیسے آؤں۔ یہ ظاہر بھی کرنا نہیں چاہتا تھا کہ مکان بیچنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ ظاہر کرنا مصلحت کے خلاف بھی تھا اور پھر آنے والے دنوں سے ساری بیزاری کے باوجود ابھی میں مذبذب تھا۔ خیر کچھ کہنے لگا تھا کہ کامریڈ آن دھمکا۔ بات منہ ہی میں رہ گئی۔ کامریڈ نے میز پہ چائے کی پیالیوں کے برابر اپنا تھیلا رکھتے ہوئے پراپرٹی ڈیلر کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

پراپرٹی ڈیلر کچھ سٹپٹا سا گیا۔ کیوں؟ میں نہیں سمجھ سکا۔

"سلام علیکم"۔

"وعلیکم السلام"۔ کامریڈ نے پراپرٹی ڈیلر کے سلام کا جواب بہت روکھے لہجے میں دیا۔ مجھے لگا کہ وہ ایکدوسرے کو جانتے ہیں۔ اس حد تک کہ کسی قدر ایکدوسرے کو سمجھتے بھی ہیں۔ کامریڈ کی آمد نے پراپرٹی ڈیلر تو سٹپٹایا ہوا تھا ہی، اِدھر میرا بھی حال یہ تھا کہ جیسے میں چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہوں۔

"کامریڈ، چائے چلے گی نا؟"

"کیوں، بہت جلدی میں ہو۔" کامریڈ نے مجھے گھور کر دیکھا۔ "کیا کہیں جانا ہے؟"

"نہیں۔ جانا کہاں ہوتا۔ ٹھیک ہے، ٹھہر کے پئیں گے"۔

پراپرٹی ڈیلر اکھڑ تو پہلے ہی گیا تھا، کامریڈ کے ان فقروں سے جو بڑے معنی خیز لہجہ میں کہے گئے تھے بالکل ہی اکھڑ گیا۔ فوراً ہی کھڑا ہو گیا:

"اچھا جناب۔ مجھے اجازت دیجیے"۔

"اچھا پھر کسی وقت آیئے۔ باتیں ہوں گی"۔ میں اسے گیٹ تک چھوڑنے گیا اور ایک دفعہ پھر اصرار کیا کہ کسی وقت ضرور آئے۔

واپس آکر بیٹھا ہی تھا کہ کامریڈ نے ہلہ بول دیا:

"یہ فراڈیا تمہارے پاس کیا لینے آیا تھا؟"

"تم اسے جانتے ہو؟"

"میں اس شہر کے ہر فراڈیے کو پہچانتا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ تمہارا اس کے ساتھ کیا چکر ہے۔ کیا کوئی نئی جائداد خرید رہے ہو۔ سوداسوچ سمجھ کے کرنا"۔

"نئی جائداد؟ تم نئی کی بات کر رہے ہو۔ یہاں پرانی بلائے جان بنی ہوئی ہے۔ میں اسے ٹھکانے لگانے کے لیے پھر رہا ہوں"۔

"اچھا اچھا۔ گھونسلہ کو ٹھکانے لگا رہے ہو۔ بوجان نے ایک مرتبہ مجھ سے ذکر کیا تھا بلکہ فریاد کی تھی کہ تمہارا دوست مکان بیچنے پہ تلا ہوا ہے۔ تو گویا وہ بھوت تم پہ ابھی تک سوار ہے۔"

"یار اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آ رہا۔"

کامریڈ نے ایک زہر بھرا قہقہہ لگایا: "تیری ماں نے خصم کیا۔ بُرا کیا۔ کر کے چھوڑ دیا اور بھی بُرا کیا۔"

"ناں یار یہی سمجھو لو۔ مگر کیا کیا جائے۔ ایک تو ہاؤسنگ کارپوریشن نے میری ایسی کی تیسی کر رکھی ہے۔ شروع میں قسطیں ادا نہیں کی تھیں ان کی سزا اب تک بھگت رہا ہوں ساس کے سُود نے میرا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ پھر جو قرض خواہ سوئے ہوئے تھے وہ بھی جاگ اٹھے ہیں۔ سوچتا ہوں کہ مکان کو اونے پونے بیچو اور قرض خواہوں سے اپنی جان چھڑاؤ۔"

"تو پھر بھابی کو بھی طلاق دے رہے ہو؟"

"کیا مطلب؟" میں نے غصے سے کامریڈ کو دیکھا۔

"دیکھو کامریڈ۔ اس میں بُرا ماننے کی کوئی بات نہیں ہے۔" اب کامریڈ سنجیدگی سے بول رہا تھا۔ "شریف لوگ زندگی میں ایک ہی دفعہ شادی کرتے ہیں اور ایک ہی دفعہ مکان بناتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ جتنے ارمانوں سے شادی کی جاتی ہے اتنے ہی ارمانوں سے مکان بنایا جاتا ہے۔ مگر ارمان تو بس ارمان ہی رہتے ہیں۔ شادی والے ارمان ہم نے تو ازدواجی زندگی میں کبھی پورے ہوتے دیکھے نہیں۔ مگر اس وجہ سے کوئی شریف آدمی بیوی کو طلاق تو نہیں دے دیتا۔"

میں خاموش سنتا رہا۔ اتنے میں اندر سے چائے کی ٹرالی آ گئی۔ کامریڈ کو چائے بنا کر دی۔ جب دیکھا کہ کامریڈ اب ٹھنڈا ہو گیا ہے تو میں نے کہا:

"یار کامریڈ۔ ایک بات بتاؤ۔ تم تو مکان بنانے کے قائل ہی نہیں ہو۔ اسے سخت

غیر انقلابی بلکہ انقلاب دشمن کاروبار سمجھتے ہو۔ سو تم نے مکان نہیں بنایا۔ پھر تم میرے مکان بیچنے کی مخالفت کیوں کر رہے ہو؟"

"میری چھوڑو۔ میں نے شادی بھی تو نہیں کی۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے شادی کر لی ہوتی تو پھر تم بھی مکان بناتے۔"

"بناتا یا نہ بناتا' بنانے کے چکر میں ضرور مبتلا ہو جاتا۔"

"شاید کامریڈ۔ تیرے حق میں یہ اچھا ہی ہوتا۔"

"اپنے کام سے جاتا۔ یہی اچھا ہوتا نا۔"

"کامریڈ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ شادی، اولاد، مکان، یہ جھمیلے ضرور ہیں، مگر ضروری بھی ہیں۔ ان کی وجہ سے آدمی تھوڑا اٹک جاتا ہے۔ کچھ جڑ پکڑ لیتا ہے۔ نہیں تو زندگی کے بہاؤ میں آدمی تنکے کی طرح بہتا ہی رہتا ہے۔"

"دم کٹی لومڑیوں کا فلسفہ۔" کامریڈ نے تحقیر سے کہا۔

میں کچھ بولنے لگا تھا کہ کامریڈ نے بات کاٹ دی: "یار کوئی کام کی بات کرو۔ لاؤ سگریٹ پلاؤ۔"

میں نے سگریٹ پیش کی۔ کامریڈ نے سگریٹ سلگائی۔ لمبے لمبے کش لیے۔ اپنا تھیلا اٹھایا اور چل کھڑا ہوا۔

بہر حال کامریڈ اپنا کام کر گیا۔ فیصلہ پہ پہنچتے پہنچتے میں پھر ڈانوا ڈول ہو گیا۔